ISSN E: 2709-8273
ISSN P: 2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL

Vol.8. No.3.2025

زندانی ادب: حبیب جالب کی حبسیہ شاعری کا تجزیہ

PRISON LITERATURE: AN ANALYTICAL STUDY OF HABIB JALIB'S POETRY OF INCARCERATION

نصراللہ شعیب

لیکچرار، گورنمنٹ ایسوسی ایٹ کالج، ٹبہ سلطان پور ضلع وہاڑی

chemicalengineer159@gmail.com

نازیہ انصاری

لیکچرار، شعبہ اردو، یونیورسٹی آف سدرن پنجاب، ملتان

nazia@usp.edu.pk

فاخرہ بی بی

لیکچرار شعبہ اردو، خانیوال پبلک سکول و کالج یونیورسٹی، خانیوال

fakhrafakhra640@gmail.com

Abstract:
Prison literature, or "Zindani Adab," refers to writings created during incarceration or those that explore themes of imprisonment, even if composed in a free environment. This genre encompasses prose and poetry directly tied to the experience of captivity, spanning academic, scholarly, and political domains. The defining feature is the author's connection to the narrative of imprisonment. Since its inception, Pakistan has faced persistent instability, exploited by undemocratic forces. Among those who resisted was the revolutionary poet Habib Jalib, who fearlessly opposed social and political injustices. Throughout Pakistan's history, from its formation to periods of martial law and democracy, Jalib's voice remained unyielding despite repeated imprisonment. A prisoner only to his conscience, he rejected compromise and boldly advocated for social progress.Jalib's prison poetry, crafted without the tools of pen and paper, offers profound insights into Pakistan's socio-political struggles. His work not only highlights the pain of oppression but also inspires future generations, serving as a testament to resilience and the pursuit of truth in the face of adversity.
Key Words: *Prison Literature, Incarceration Imprisonment, Political Resistance, Social Injustice, Resilience, Socio-Political Struggles, Truth and Conscience.*

جرم اور سزا کے ساتھ ساتھ حق بات یہ کوڑے اور زنداں کا نظام روزِ اول سے قائم ہے۔ زنداں میں عمومی طور پر کسی معاشرتی برائی کے شکار لوگوں کو بطور سزا رکھا جاتا ہے تاکہ یہ نفسیاتی بیمار لوگ معاشرے کو مزید تعفن زدہ نہ کر سکیں۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ جیل کا ہر قیدی کسی معاشرتی برائی کا ہی مرتکب ہو۔ بعض دفعہ مطلق العنان استحصالی قوتیں اپنے مخالفوں کو دبانے کے لیے انہیں سیاسی مجرم قرار دے کر بھی انہیں عقوبت خانوں میں بند کر دیتی ہیں تاکہ ان کے مفادات کو چیلنج نہ کیا جا سکے اور نہ ہی صحت مند معاشرہ تشکیل دیا جا سکے۔ قید کی سیاسی، مذہبی، سماجی کئی طرح کی وجوہات ہو سکتی ہیں لیکن مقصد ایک ہی ہوتا ہے کہ شاعر یا ادیب کو خاموش کروا کے معاشرے کو ذہنی طور پر نوآبادیاتی بنانا۔ تاریخی حقائق اس بات پر شاہد ہیں کہ اکثر لوگوں نے جیل میں بیٹھ کر وہ معرکتہ الارا تصانیف قلمبند کی ہیں جنہوں نے صرف اپنے عہد کی خلقت کو ہی متاثر نہیں کیا بلکہ مستقبل میں بھی لوگ اُن سے راہنمائی لیتے رہے۔ ایسا ادب جو قید خانے کے وحشت زدہ اور قیدِ تنہائی کے حبس زدہ مشاہدات و تجربات سے متعلق ہو زندانی ادب کہلاتا ہے۔ زندانی ادب ایک وسیع المفہوم صنفِ ادب ہے عمومی طور پر نظر بندی، مارشل لاء یا کسی پابندی کے زیرِ اثر لکھا جانے والا ادب بھی زندانی ادب کے دائرہ کار میں شامل کیا جا سکتا ہے لیکن یہ ضروری ہے کہ اُس کا موضوع مشاہداتِ زنداں یا متعلقاتِ زنداں ہی ہو۔ حبسیہ نثر کی تعریف کرتے ہوئے صائمہ علی رقمطراز ہیں:

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL

Vol.8. No.3.2025

" حبسیہ نثر سے مراد وہ تحریر ہے جو قید میں رہ کر یا بعد میں قید سے متعلق لکھی گئی ہو اور جس کا انداز شخصی ہو۔ قید میں رہ کر غیر شخصی تحریر حبسیہ نثر کی ذیل میں نہیں آتی۔ حبسیہ نثر کے لیے کسی مخصوص صنف کی قید نہیں۔ اس کے نمونے، آپ بیتی، خطوط، رپور تاژ، سوانح عمری، سفر نامہ، انٹرویوز کی صورت میں ملتے ہیں۔"(1)

زندانی ادب کا تعلق ریاستی جبر سے ہے۔ جبر و تشدد کی مخالفت میں آواز اٹھانا اور جذبات کا آزادانہ اظہار انسانی سرشت میں شامل ہے۔ کسی بھی زبان کا ادب اپنے سماج کا آئینہ ہوتا ہے دونوں ہی ایک دوسرے کے اثرات کو قبول کرتے ہوئے ایک دوسرے کی تعمیر و ترقی میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ ادب محض فنی باریکیوں یا جمالیاتی حسن کا نام ہی نہیں بلکہ معاشرے کی اجتماعی زندگی میں مثبت تبدیلیاں لانے کا نام بھی ہے۔ یہ زندگی اور سماج کا مفسر ہوتا ہے، ہماری سماجی اور معاشی حیات سے اسی طرح تاثر قبول کرتا ہے جس طرح ہماری دوسری حرکات و سکنات۔ ادیب بھی اسی سماج کا ایک فرد ہوتا ہے، وہ قادر مطلق کی طرح صرف کن کہنے سے ادب تخلیق نہیں کرتا بلکہ معاشرے کے شیریں اور تلخ تجربات سے ہی وہ اپنی تحریر کا مواد حاصل کرتا ہے۔ اُس کی تحریر و تخلیق میں داخلی کشمکش اور اندرونی اُبیج ضرور اہم کردار ادا کرتی ہے لیکن یہ داخلی کشاکش بھی خارجی حالات و اسباب کا نتیجہ ہوتی ہے جس کو تہذیب، ثقافت یا تمدن کہتے ہیں۔ عام ادب کے مقابلے میں زندانی ادب و ادیب کا سماجی شعور اور سماج سے وابستگی گہری اور توانا ہوتی ہے کیونکہ اُسی ادیب کو داخل زنداں کیا جاتا ہے جس کی سماج میں جڑیں گہری اور مضبوط ہوتی ہیں بلکہ اُس کے پسِ دیوار زنداں جانے کے پیچھے جو محرکات ہیں وہ بھی سماجی ہی ہوتے ہیں۔ زندانی ادیب پس دیوار زنداں خوف زدہ ہو کے دبک کر بیٹھ نہیں جاتا بلکہ لوگوں کو حرکت و عمل پر اکساتا ہے قید تنہائی میں اُس کا قوت تخیل، قوت احساس اور سماجی شعور بڑھ جاتا ہے. وہ اپنے عہد کے جبر و ستم کو اس دردِ دل کے ساتھ صفحہ قرطاس پر منتقل کرتا ہے کہ وہ اپنے عہد کی تاریخی شہادت کے علاوہ اپنے عہد کی سماجی و ثقافتی منظر کاری کے ساتھ ساتھ مستقبل میں معاشرے کے لیے منشور کا کام بھی دیتی ہے۔ جیسے زندانی تصنیف "کالا پانی" میں سیاسی احوال کے ساتھ ساتھ وہاں کے سماجی و ثقافتی ماحول کی منظر کشی بھی ہے۔ " غبار خاطر " از ابو الکلام آزاد میں اسلوب کے ذائقوں کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی تہذیب و ثقافت کے حسین مناظر بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد مقتدر طبقات کی باہمی کشاکش کس طرح ہماری سماجی اور سیاسی تاریخ پر اثر انداز ہوئی، ملکی سیاسی عدم استحکام سے کون فیض یاب ہوا اور کن درد کے ماروں نے تاریخ کا کرب خود پر جھیلا؟ تاریخ کے اس ادھورے سچ کی پشت پر چھپے پورے سچ کو سمجھنے کے لیے جن ادیبوں نے خون دل میں انگلیاں ڈبو کر اپنے افکار و خیالات کی سچائی کو سرنگوں نہیں ہونے دیا اُن میں ایک معتبر آواز حبیب جالب کی ہے۔ حبیب جالب بائیں بازو کے سیاسی نظریات رکھنے والے ایک نڈر سیاسی راہنما، ترقی پسند انقلابی شاعر اور اصول پسند انسان تھے جالب کی شاعری معاشرے کے پسے ہوئے اور طبقاتی نظام کے ستائے ہوئے لوگوں کی آواز تھی۔ اُن کا مقصدِ حیات سماجی و سیاسی انقلاب تھا۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے عوام کی بات عوام کی ذہنی سطح پر آ کر کی تاکہ جن کی زندگی بدلنا مقصود ہے وہ بات کو سمجھ بھی سکیں۔ اس گناہ کی پاداش میں ہر عہد میں خواہ جمہوری عہد ہو یا غیر جمہوری عہد، جالب کی آواز کو زنجیر بپا کرنے کی کوششیں کی گئیں، انہیں پابند سلاسل کیا گیا، شہر بدر کیا گیا، مشاعرے تک بند کر دیے گئے لیکن حالب صبح بے نور کا باغی تھا۔ نہ کسی آمر کے سامنے سر کو جھکایا اور نہ کسی صلے کی پروا کی بلکہ وہ کوہ گراں کی طرح اپنے نظریات پر قائم رہا۔ سید سبط حسین اپنے مضمون "سچا عوامی شاعر" میں لکھتے ہیں

"کانٹوں کی پیاس بجھانا جالب کا مقدر بن گیا ہے اور چارہ غم کی نوید سنانا ان کا مسلک زیست۔ اگر ایک آنکھ سے روتے اور دوسری سے ہنستے ہیں تو ان کا یہ رونا اور ہنسنا دونوں عوام ہی کے حوالے سے ہے۔ وہ روتے ہیں عوام کے حالِ زار پر اور ہنستے ہیں ان کے روشن مستقبل پر۔ ان کی شاعری شکستِ دل کی صدا بھی ہے اور سوزِ یقین کی للکار بھی۔ وہ دل توڑنے والوں کے ثروت و اقتدار سے کبھی نہیں ڈرے بلکہ اندھیرے کے پجاریوں نے شب خون مارنے کے بعد جو نقاب بھی اوڑھی جالب نے اس کو نوچ کر پھینک دیا۔"(2)

جالب اشتراکی زاویہ نگاہ کی وجہ سے ترقی پسند تحریک سے متاثر ضرور تھے لیکن انھوں نے اپنی شاعری کو کسی تحریک یا سیاسی پلیٹ فارم کے تابع نہیں ہونے دیا۔ بلکہ جالب خود اپنی ذات کے اندر ایک مکمل تحریک رکھتے تھے۔ جالب اگر چاہتے تو آمروں کے قصیدے لکھ کر اپنا اور اپنے بچوں کا مستقبل بہتر بنا سکتے تھے لیکن انہوں نے حکمرانوں اور سرمایہ داروں کے مفادات کے تحفظ اور قصیدے لکھنے کی بجائے عوام کی محرومیوں کے رجز اور مرثیے لکھے۔ جالب کی آواز پرولتاریہ طبقہ کے دل کی آواز تھی۔ مغربی پاکستان میں

آمریت کے خلاف سب سے مستحکم اور توانا آواز حبیب جالب کی تھی۔ تقریباً چار دہائیوں تک عوامی جلسوں اور مشاعروں میں یہ آواز گونجتی رہی۔ اپنے اصولوں کی پاسداری میں اس کے قدم ڈگمگائے نہیں بلکہ وہ علی الاعلان اس بات کا اظہار کرتے رہے۔

صیاد کے ہم پنجہ بیداد سے ڈر کر
تزئینِ گلستان سے گریزاں نہ رہیں گے (3)

جالب کی جیل یاترا کا جو دور ایوب کی آمریت سے شروع ہوا تھا وہ بھٹو کے خود ساختہ جمہوری عہد میں بھی اُسی آب و تاب سے قائم تھا۔ ایوب کے آمرانہ عہد میں اُن کی کتاب "سر مقتل" پر پابندی لگی۔ عہد یحیٰی میں "بندے کو خدا کیا لکھنا" اور بھٹو کے عہد میں اُن کا شعری مجموعہ "ذکر بہتے خون کا" ضبط ہوا۔ جالب عوام کا شاعر تھا، اگر عوام سکھی اور آزاد نہیں تو جالب کیسے سکھی اور آزاد رہ سکتا تھا۔ زاہدہ حنا جالب کے پس دیوار زنداں تخلیق کیے جانے والے فن کے متعلق لکھتی ہیں:

"جالب ان خوش نصیبوں میں سے ہے جو خود بھی پابند سلاسل رہے اور جن کی تحریروں پر قدغن رہی۔ اس زمانے کے آمروں کو شاید اس کا علم نہ تھا کہ صدیوں پہلے بیتائل کے بندی خانے میں کتابیں بھی پابہ زنجیر تھیں۔ انہیں معلوم ہوتا تو پیروی میں وہ بھی اس کی کتابوں کو کوٹ لکھپت جیل میں یا شاہی قلعہ کی تہ خانوں میں زنجیروں سے جکڑ کر رکھتے اور خوش ہوتے کہ وہ صرف جالب کو ہی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنانے میں کامیاب نہیں ہوئے ہیں بلکہ انہوں نے اس کے لکھے ہوئے لفظوں کو بھی آہنی زنجیروں کا اسیر کیا ہے۔ خوشبو کو بیڑیاں پہنائی ہیں، روشنی کو ہتھکڑیاں ڈالی ہیں اور زندگی کے گلے میں طوقِ غلامی آویزاں کیا ہے۔ لیکن جالب نے ہر عہد میں روشن حرف لکھے ہیں جن کی روشنی اور تاثیر زندانوں سے باہر بھی پہنچتی ہے۔" (4)

1976ء میں نیشنل عوامی پارٹی سے سیاسی وابستگی کی وجہ سے اُن پر بغاوت کا الزام لگا کر انہیں تین سال کی قید کی سزا سنائی گئی یہ کیس تاریخ میں حیدر آباد سازش کیس کے نام سے مشہور ہوا۔ اس قید کے دوران جالب نے جو تحریر کیا وہ کتاب "گوشے میں قفس کے "کی شکل میں شائع ہوا"برگ آوارہ" سے "گوشے میں قفس کے "تک کے شعری سفر کے حوالے سے حبیب جالب لکھتے ہیں:

"برگ آوارہ دھیمے لہجے کی شاعری ہے جس میں چھوڑے ہوئے دریاؤں اور بچھڑے ہوئے یاروں کی یادیں بکھری پڑی ہیں۔ جگہ جگہ عدم تحفظ کا احساس شدت سے پایا جاتا ہے۔ بعد میں آنے والی کتابوں میں دھیما لہجہ بلند آہنگ ہو گیا، کیوں نہ ہوتا کہ ایک منظم منصوبے کے تحت وطنِ عزیز کو خوفناک آمریت کے شکنجے میں جکڑا جا رہا تھا۔ جتنا حبس بڑھتا گیا لہجہ اتنا ہی تند و تیز ہوتا گیا اور اسی لہجے کی وجہ سے کئی بار پس دیوار زنداں گیا اور زنداں سے ایک شعری مجموعہ لے آیا۔" (5)

حیدر آباد سازش کیس میں بغاوت کے الزام میں جب انہیں لاہور سے گرفتار کیا گیا اس دن ان کے بارہ سالہ بیٹے طاہر عباس کا سوئم تھا۔ جالب کے لیے یہ سانحہ کسی قیامت سے کم نہ تھا۔ اس واقعے نے جالب کو نفسیاتی طور پر بہت متاثر کیا۔ جالب کی پوری کلیات میں مظلوموں اور محکوموں کے دکھوں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ لیکن اس کتاب میں جالب کے اجتماعی غموں کے ساتھ ساتھ انفرادی غموں کی بازگشت بھی سنائی دیتی ہے۔ یہ جیل کا جالب پر نفسیاتی اثر ہے کہ تمام عمر اجتماعی غم پر انفرادی دکھ کو قربان کرنے والا شاعر جیل میں انفرادی غم بیان کر رہا ہے۔ نظم "طاہر عباس کی یاد میں" ایسے ہی انفرادی غم کی گہری وابستگی کا اظہار ہے:

آج وہ زندہ ہوتا وہ بھی خط لکھتا مجھے
پڑھ کے نور افشاں کا خط وہ اور بھی یاد آیا مجھے
یوں تو کیا پایا ہے اس جینے میں اشکوں کے سوا
زندگی بھر اس کا کھو جانا نہ بھولے گا مجھے (6)

نظم "ملاقات" میں بھی ایسی ہی نفسیاتی وابستگی کا پرچار ہے۔

جو ہو نہ سکی بات وہ چہرے سے عیاں تھی
حالات کا ماتم تھا ملاقات کہاں تھی (88)

گوشے میں قفس کے "ایک انقلابی باغی شاعر کا حبسیہ ضرور ہے جس نے پوری زندگی ہواؤں کی مخالف سمت میں چراغ جلائے ہیں، لیکن یہ انقلابی بھی گوشت پوست کا ایک انسان ہے۔ اس کے اندر ایک حساس محبت کرنے والے باپ کا دل بھی ہے۔ حالات کی سنگینی نے اس کو ظلم وجبر کی فولادی دیوار پر نقب زنی ضرور کروائی لیکن محبت، حسن اور الفت کے گیت گانا وہ بھولا نہیں۔ نظم "ننھی جاسو جا" میں بھی اپنے انقلابی رنگ کی بجائے ایک منفرد جالب نظر آتے ہیں۔ جالب کے موضوعات اور آہنگ کی تبدیلی کی بہت سی وجوہات ہیں۔ ان میں ایک وجہ یہ بھی تھی کہ آمریت پسند ماحول میں مظلوم کی آواز بننے میں جالب کے ساتھ اور بھی ہمنوا دوست تھے۔ کچھ سے تو ان کی نظریاتی وابستگی بھی تھی لیکن وقت کے ساتھ ساتھ وہ مفاہمت پسند ہو گئے۔ انہوں نے مصلحت ِ وقت کے تقاضے کے تحت لبوں پر خاموشی سجالی، لیکن جالب مفاہمت نہ کر سکا۔ اس نے انقلابی آواز کے ساتھ بلند ہوتے تازیانوں کو اپنے جسم پر برداشت کیا۔ اس نے سسکتے بلکتے استحصال زدہ طبقات کے غموں کو اپنے ذاتی غموں پر جہاں تک ممکن ہو سکا ترجیح دی۔ لیکن جب ملک میں جمہوریت نے فروغ پایا مگر اس کے ثمرات استحصالی طبقات تک منتقل نہ ہو سکے تو کچھ حد تک جالب کو مایوسی نے آن گھیرا۔ اسے اپنے غموں کی طرف دیکھنے کا موقع ملا۔ اپنے بیوی بچوں کا احساس ہوا جن کا پرسانِ حال جالب کے سوا کوئی نہ تھا۔ "گوشے میں قفس کے" میں شامل نظمیں جن میں "بچوں کے نام، اے مری ہمدم نہ رو، میری بچی، ننھی جاسو جا، ملاقات، رخشندہ زویا کے نام اور اپنے بیٹے طاہر عباس کی یاد میں" اسی ذہنی وفکری طرز احساس اور فکر پر مشتمل نظمیں ہیں۔ "ننھی جاسو جا" کے اشعار ملاحظہ کریں:

جب دیکھو تو پاس کھڑی ہے ننھی جاسو جا
تجھے بلاتی ہے سپنوں کی نگری جاسو جا
غصے سے کیوں گھور رہی ہے میں آجاؤں گا
کہہ جو دیا ہے تیرے لیے اک گڑیا لاؤں گا
گئی نہ ضد کرنے کی عادت تیری جاسو جا(8)

احتجاجی آواز کے بارے پر عمومی اعتراض یہ ہوتا ہے کہ اس کے موضوعات وقتی ہوتے ہیں اور یہ تخریب اور پروپیگنڈا کو جنم دیتے ہیں۔ لیکن ناقدین اعتراض کرتے وقت اس حقیقت کو بھلا بیٹھتے ہیں کہ احتجاجی ادب اپنے عہد میں جو تبدیلیاں لاتا ہے، اپنی کامیابی اور ناکامی دونوں صورتوں میں یہ مرتا نہیں بلکہ ایک تاریخی دستاویز بن جاتا ہے جو جدوجہد اور مزاحمت کی تاریخ پیش کرنے کے ساتھ ساتھ آنے والے لوگوں کو ظلم وبربریت کے خلاف تیار کرتا ہے۔ اس طرح دنیا میں جب تک ظلم ہوتا رہے گا یہ شاعری زندہ رہے گی اور لوگوں کے لہو کو گرماتی رہے گی۔ اس لیے جالب کہتے ہیں:

اے نظام کہن کے فرزندو
اے شبِ تار کے جگر بندو
یہ شبِ تار جاوداں تو نہیں
یہ شبِ تار جانے والی ہے
صبحِ نو مسکرانے والی ہے (9)

جالب کی بیشتر شاعری کا محرک کوئی نہ کوئی سیاسی اور سماجی پس منظر ہے اس لیے ان کی شاعری، مشاعروں کی بجائے عوامی جلسوں میں زیادہ مقبول ہوئی۔ بعض ناقدین اس بنیاد پر جالب کی شعرانہ عظمت پر نقد کرتے ہیں کہ یہ جلسے کی لمحاتی شاعری ہے۔ اس میں ادب کی مینہ کاری سے زیادہ تخریب کی لے موجود ہے۔ لیکن نقد کرنے والے شاعر کے اُس مخصوص سماجی اور سیاسی حالات کو نظر انداز کر جاتے ہیں جس میں وہ تخلیق ہوئی اور پھل پھول کر ایک تناور درخت بنی۔ جالب پر اس طرح کے اعتراضات ان کے مخالفوں نے ہی نہیں بلکہ نظریاتی دوستوں نے بھی اٹھائے۔ اس کی وجہ ان کی سیاسی وابستگی اور اصولوں پر قائم رہنے کی عادت تھی۔ جالب کے بہت سے دوست جو بائیں بازو کے نظریات رکھتے تھے انہی وجوہات کی وجہ سے ان سے راہیں جدا کر گئے۔ یہ حقیقت ہے کہ جالب کی شاعری عوامی جلسوں میں مقبول ہوئی اور کسی مخصوص پس منظر کے بغیر یہ نظمیں تخلیق نہیں ہو سکتی تھیں۔ لیکن یہ بات بھی توجہ کے قابل ہے کہ جالب نے سماجی حقیقتوں کا بے باک اظہار کرنے کے باوجود شاعری کی روایتی زبان ترک نہیں کی اور نہ معاشرے کی گھناؤنی تصویر دکھا کر انسانیت کو مجروح کرنے کی کوشش کی ہے۔ جالب کے یہ اشعار انقلابی حقیقت کی عمدہ مثال ہیں:

اپنی تو داستان ہے بس اتنی
غم اٹھائے ہیں شاعری کی ہے
جب مہ و مہر بجھ گئے جالب
ہم نے اشکوں سے روشنی کی ہے (10)

جالب کی شاعری آنے والے ہر دستور کے خلاف یونہی آواز بلند کرتی رہے گی کہ "ایسے دستور کو صبح بے نور کو، میں نہیں مانتا میں نہیں جانتا" یہی وجہ ہے کہ چھ دہائیاں گزرنے کے باوجود آج بھی نظم "دستور" اُسی طرح مشہور و مقبول ہے۔ جالب ان دانشوروں میں سے نہیں کہ جن کے سر میں انقلاب کا سودا تو ہے لیکن ان کے دن رات نشاط و سرور میں گزرتے ہیں اور تمام عمر وہ دولت وثروت کے حصول کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ جالب کا منشور ان کے ان اشعار میں پوشیدہ ہے:

اک زلف کی خاطر نہیں انصاف کی خاطر
ٹکرائے ہیں ہر دور میں ہم کوہ گراں سے
نقاد تو بن جائیں گے حاسد میرے جالب
لائیں گے مگر میرا حسنِ ودیعت وہ کہاں سے (11)

جالب ان لوگوں میں سے نہ تھے جو خود پس پردہ رہ کر دوسروں کو سینہ سپر ہونے کی تلقین کرتے ہیں بلکہ وہ خود صلیب پر چڑھ کر دوسروں کے لیے مثال بننے والوں میں سے تھے۔ جالب نے زبانی دعوؤں سے نہیں بلکہ عملی طور پر خود کو سوشلسٹ ثابت کیا۔ جالب کی یہی عملی کوشش انہیں اپنے عہد کے دیگر ترقی پسندوں سے ممتاز کرتی ہے۔ جالب کے نزدیک ضمیر فروشی سب سے بڑا جرم ہے۔ جالب ان قلم کاروں کی کو خائن سمجھتا ہے جو مفاہمت، مصالحت یا چند کھوٹے سکوں کی خاطر اپنے ضمیرِ قلم کا سودا کرتے ہیں۔ جالب سمجھتے ہیں ایسے شاعر لوگوں کو بلند ہمتی اور عالی حوصلگی کی بجائے مفاہمت اور بزدلی سکھاتے ہیں۔ خالد محمود اپنے ایک مضمون میں جالب صاحب کے متعلق لکھتے ہیں:

"جالب سمجھوتہ کرنے والے آدمیوں میں سے نہ تھا۔ مجبوروں اور محکموں کا ترجمان بن کر وہ عمر بھر اپنے آدرشوں پر جما رہا۔ حالانکہ جس نظریے پر وہ قائم تھا وہ مزدور طبقے کے نام پر بننے والی ریاست کے خاتمے کے بعد مشکوک ہو چکا تھا۔ اگر جالب کسی سوشلسٹ ملک میں ہوتا تو بھی اپوزیشن میں ہی رہتا کیونکہ وہ مراعات یافتہ طبقات اور آمرانہ نظامِ حکومت کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔" (12)

پسِ دیوارِ زنداں جالب نے سچے اور کھرے الفاظ تخلیق کیے۔ ہمیشہ حق کو حق باطل کو باطل کہا۔ خود بھی تمام عمر روشن حرف لکھے اور غمگساروں کو بھی اسی کی نصیحت کرتے رہے

دینا پڑے کچھ بھی ہرجانا سچ ہی لکھتے جانا
مت گھبرانا، مت ڈر جانا سچ ہی لکھتے جانا
باطل کی منہ زور ہوا سے جو کبھی نہ بجھ پائیں
وہ شمعیں روشن کر جانا، سچ ہی لکھتے جانا (13)

جالب نے حق و صداقت کے چلن کو آخر دم تک نبھایا۔ وہ ظلم تو سہتا رہا لیکن اس نے مزاحمت سے دل برداشتہ ہو کر مفامت کے راستے کو اختیار نہیں کیا۔ وہ اس رزم گاہ میں سب کچھ لٹا کر بھی خوش ہے۔ اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے جالب کہتا ہے:

اہل ستم کے حلقہ بگوشوں میں ہم نہیں
صد شکر کے ان ضمیر فروشوں میں ہم نہیں (14)

جالب کی شاعری اپنی عہد اور مزاحمتی جدوجہد کی آئینہ دار ہے۔ مشکل اور کٹھن حالات اگر طویل ہو جائیں یا بار بار کی مسلسل ناکامی، انسان کو دل برداشتہ کر دیتی ہے۔ جب اداسی اور مایوسی کے سائے طویل ہونے لگیں اور تبدیلی کے آثار بھی معدوم ہوں تو انسان کے اندر بے بسی کا احساس بڑھ جاتا ہے۔

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
Vol.8. No.3.2025

بہار آئی مگر ہم کو یہ رہی حسرت
کسی روش پہ مہکتا کوئی گلاب ملے
مٹے جو راہِ وطن میں پڑے ہیں زنداں میں
وہ حکمراں ہیں سروں کے جنہیں خطاب ملے (15)

جالب کو اپنے نظریے کی سچائی پر مکمل یقین ہے۔ اس لیے وہ کہتے ہیں کہ رات چاہے کتنی طویل ہو صبح سورج کے نکلنے کو نہیں روک سکتی۔ ظلم کی رات طویل ہو سکتی ہے لیکن اس کو دوام نصیب نہیں۔

رستہ کہاں سورج کا کوئی روک سکا ہے
ہوتی ہے کہاں رات کے زنداں میں سحر بند (16)

مسلم شمیم کے گواہی کے مطابق محمد علی، جالب کے بارے میں لکھتے ہیں:

"جالب کی شاعری میں گزشتہ تین دہائیوں کی قومی، سماجی، سیاسی اور اقتصادی زندگی کی مکمل تصویر دیکھی جا سکتی ہے۔ ان کی شاعری ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ہمیں اپنا سماج نشیب و فراز سے گزرتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ یہ بیشتر سفر دکھوں کا سفر ہے مگر جالب نے مسافرِ محبت کا حوصلہ کبھی پست نہیں ہونے دیا اور تمام زندگی بھرپور اعتماد کا فانوس جلائے رکھا۔" (17)

جالب کی شاعری احتجاج کی شاعری تھی۔ لیکن جالب نے اپنے احتجاج کی لَو کو رجائیت کے طاق میں رکھ کر پیش کیا تا کہ تپش سے ہاتھ نہ جلیں اور نہ شاعری کو انارکی بننے دیا۔ اب اس معتدل روشنی میں اگر جالب کی شاعری کا جائزہ لیں تو ہمیں ایک ایسا شاعر نظر آتا ہے جس نے اپنے عہد کے شاعروں سے خود کو الگ کر کے معاشرے کی اصلاح کا فریضہ اپنے ناتواں کندھوں پر اٹھایا ہے۔ جالب کی نظم **"میری بچی میں آؤں نہ آؤں"** کا ایک بند ملاحظہ کریں:

درد کی رات ہے کوئی غم کی
ٹوٹ جائے گی زنجیر غم کی
مسکرائے گی ہر آس تیری
لے کے آئے گا خوشیوں سویرا
آنے والا زمانہ ہے تیرا (18)

نظم "آنے والا زمانہ ہے تیرا" میں پڑھنے والوں کو جالب کی بچی میں مظلوم طبقے کی وہ بیٹی نظر آئے گی جس نے اندھیرے میں اور مایوسی کے کہرے میں آنکھ کھولی۔ اس کے چاروں طرف بزرگوں کی ناکامیوں کی سیاہی ہے جو قدم قدم پر اس کا راستہ روکتی ہے۔ جالب اس نظم میں بچی کو بہترین اور روشن مستقبل کی بشارت دیتے ہیں۔ جالب کی شاعری کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ یہ بے چینی اور بے اطمینانی پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ معاشرے کو تشکیل اور بہتری کے لیے بھی آمادہ کرتی ہے۔ ان کی شاعری میں روایتی حسن اور نزاکت کے ساتھ ساتھ آج کی دکھی زندگی کا آشوب بھی شامل ہے اور آنے والے سنہرے زمانے پر یقین بھی۔ جالب کی اس ذہنی اور نفسیاتی انتشار کی جھلک ان کی نظم "اے میری ہمدم نہ رو" میں بھرپور عکاسی کرتی ہے۔ جالب نے اپنی نظموں میں صرف ذاتی غم کو ہی بیان نہیں کیا بلکہ وہ ذاتی غم کی حد سے نکل کر اپنے انفرادی غم کو اجتماعی غم میں تبدیل کر کے معاشرے کا نوحہ بیان کیا ہے۔ اپنے جواں سالہ بیٹے کی موت پر وہ خون کے آنسو صرف اپنے بیٹے کی جدائی میں نہیں بہاتا بلکہ وہ ہر اس ماں کے درد کو بھی محسوس کرتا ہے جس کے بچے کوڑا کو اٹھا کر لے جائیں یا بوٹوں والے انہیں مسنگ پرسن بنا کر اپنے بوٹوں تلے روند دیں۔ جالب نے ذاتی دکھ کو اپنے شاعرانہ جذبات اور تخیل کی معرفت سے اجتماعی بنا دیا۔ ان کی یہ نظم پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے جس میں ایک دکھی باپ کی دلی کیفیت ایک وسیع دائرے میں داخل ہو گئی ہے

پونچھ لے آنسو میری جاں، اے میرے ہمدم نہ رو
اپنا بچہ ہو گیا بیمار، آخر مر گیا

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

وہ بھی بچہ ہے جسے قاتل اٹھا کر لے گئے

جو نہ آنکھوں سے کبھی چھلکے وہ آنسو دے گئے

پھول کتنے ہی یہاں بوٹوں تلے روندے گئے

غم کا لشکر کتنے آنگن آنسوؤں سے بھر گیا(19)

جالب قول اور فعل کے شاعر ہیں انہیں اس بات کا احساس ہے کہ سچا شاعر عوام کا نمائندہ ہوتا ہے۔ اس لیے جب وہ انسانوں کو اداس اور مایوس دیکھتا ہے تو خود مایوس نہیں ہوتا بلکہ انہیں مایوسی سے نکالنے کی سعی کرتا ہے۔ انہیں خوش کن مستقبل کے خواب کر مستقبل سے کبھی مایوس نہیں ہونے دیتا۔ پس دیوار زنداں بھی وہ حسین مستقبل کے لیے نغمہ سرا ہے اور روزن زنداں سے صبح فردا کا منظر دیکھ رہا ہے۔ جالب کا کمال یہ ہے کی ساری زندگی مفلوک الحالی میں گذارنے کے باوجود اس نے رجائیت کا دامن کبھی نہیں چھوڑا۔ ان کی نظم "میں ضرور آؤں گا ایک عہد حسین کی صورت" احتجاجی رجائیت کی بہترین مثال ہے۔

میں ضرور آؤں گا ایک عہد حسین کی صورت

دکھ میں ڈوبے ہوئے دن رات گزر جائیں گے

کوئی تحقیر کی نظروں سے نہ دیکھے گا ہمیں

پیار کے رنگ ہر ایک سمت بکھر جائیں گے

پیارے اگائے گی نگاہوں کو سکوں بخشے گا

یہ زمین خلد بریں کی صورت

میں ضرور آؤں گا ایک عہد حسیں کی صورت (20)

زاہد فخری اپنے مضمون "حبیب جالب، زندہ شاعر" میں جالب کی انسان دوستی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"جس طرح "لورکا" چاہتا تھا کہ مرنے کے بعد بھی اس کی کھڑکی کھلی رہے تاکہ وہ بچوں کو گلی میں ناشپاتیاں کھاتے ہوئے دیکھ سکے، اسی طرح جالب اپنی آخری سانسوں تک ایک خوشحال نسل کا منتظر رہا۔ ایک ایسے معاشرے کے خواب دیکھتا رہا جہاں کوئی وڈیرہ نہ ہو جہاں سب کی عزتیں محفوظ ہوں، جہاں کوئی طاقت در کسی کمزور پر ظلم نہ کر سکے، جہاں سچی جمہوریت کا سورج ہر غریب کے گھر تک پہنچ سکے، جہاں مائیں کھیتوں سے کپاس چنتی بیٹیوں کو دیکھ کر سو طرح کے فکروں میں نہ ڈوب جائیں، جہاں پڑھنے گئے ہوئے بچے بحفاظت گھر آسکیں۔"(21)

نظم ہتھکڑی جالب کی بہترین نظموں میں سے ایک ہے۔ جب جالب کو ضبط شدہ کتاب "سر مقتل" سے نظم پڑھنے کی پاداش میں گرفتار کیا گیا۔ دو سال کی بچی جمیلہ نور افشاں ماں کی گود سے باپ کی گود میں جانے کے لیے بے قرار و بے چین تھی۔ زنجیر کی کھنک سے ننھی افشاں مسکرانے لگی۔ وہ زبان حال سے کہنا چاہتی ہو گی کی یہ میرا کھلونا ہے اور اپنے والد کی ہتھکڑی کو کھلونا سمجھ کر کھیلنے لگی۔ جالب نے دست شفقت بیٹی کے سر پر رکھ کے کہا ہو گا یہ تمہارا نہیں میرا کھلونا ہے۔ جالب کو بڑا شاعر تسلیم کروانے میں اس بچی کا بھی کچھ حصہ ہے کیونکہ اس نظم کی تخلیق کا سبب یہی ننھی بچی تھی۔ جس کی ہنسی جالب کے لئے جیل میں سوہان روح تھی۔

اس کو شاید کھلونا لگی ہتھکڑی

میری بچی مجھے دیکھ کر ہنس پڑی

یہ ہنسی تھی سحر کی بشارت مجھے

یہ ہنسی دے گئی کتنے طاقت مجھے

اس قدر زندگی کو سہارا ملا

ایک تابندہ ہے کل کو ستارہ ملا(22)

نظم ہتھکڑی شاعر کی جذباتی وابستگی کو یاس و بیم میں مبتلا کرتی ہے اور ساتھ ہی یہ اہمیت بھی اسے فراہم کرتی ہے کہ اپنی کمزوری کو اپنی سب سے بڑی طاقت بنالو۔ جالب بیٹی کی ہنسی سے روشن مستقبل کی تمنائیں وابستہ کرتے ہیں۔ مشکل سے مشکل حالات میں بھی وہ مایوس اور ناامید نہیں ہوتے۔ بلکہ عہد سزا میں بھی امید کا جگنو ان کے خیالوں کو روشنی عطا کرتا ہے۔ حسن عابدی اپنے مضمون "جالب: روشن دنوں کی بشارت" میں اس نظم کے بارے لکھتے ہیں:

"یہ تین اشعار کی مختصر ترین نظم ہے لیکن اسے دنیا کے بڑے بڑے مزاحمتی ادب کے سامنے بڑے اعتماد کے ساتھ پیش کیا جاسکتا ہے۔"(23)

جالب کا یہ سماجی شعور برگ آوارہ سے لے کر ان کے آخری شعری مجموعے تک تواتر کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ ان کی کتاب "گوشے میں قفس کے" میں شامل نظم "نوجوانوں کے نام" میں اپنے عہد کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی زندگی کا حقیقت پسندانہ عکس ملتا ہے۔

زنداں میں آفتاب و قمر دیکھتا ہوں میں
ہائے یہ کیسے شام و سحر دیکھتا ہوں میں
ساری زمین چند امیروں نے گھیر لی
صدیوں سے مفلسوں کو نگھر دیکھتا ہوں میں (24)

جالب کی شاعری انسانی عظمت کی ترجمان ہے۔ اس دھرتی پر بسنے والے مجبور، بے بس اور مظلوم انسان اس کے موضوعات ہیں۔ معنوی اعتبار سے وہ آفاقی شاعر ہے۔ جالب نے محض سیاسی خداؤں کے خلاف آواز نہیں اٹھائی بلکہ ایسے مذہبی پیشوا جو مذہب کے نام پر اپنی دکانیں چمکاتے ہیں ان پر بھی طنز کی ہے۔ وہ محض زبانی تحریر یا نعروں پر نہیں بلکہ عملی مسلمان بننے کی ترغیب دیتے ہیں۔ اپنی نظم "خدا ہمارا ہے" میں انہوں نے اسلام کے ٹھیکے داروں پر جم کر تنقید کی ہے۔

لہو پیو گے کہاں تک ہمارا دھنوانو
بڑھاؤ اپنی دکان سیم و زر کے دیوانو
نشان کہیں نہ رہے گا تمہارا شیطانو
ہمیں یقین ہے کہ انسان اس کو پیارا ہے
خدا تمہارا نہیں ہے، خدا ہمارا ہے (25)

جالب نے پس دیوار زنداں بیٹھ کر وطن اور وطن کے لوگوں کے لیے نغمے میں بھی گائے۔ استبدادی قوتوں کے خلاف جمہور کی آواز بننے کی پاداش میں انہیں باغی اور غدار تک قرار دے کر پابند سلاسل کیا گیا لیکن اپنے انجام سے بے پرواہ وہ پس دیوار زنداں بھی اہل وطن کے درد و علم کا ترجمان بنا رہا۔ وہ اپنے ملک کا غدار کیسے ہو سکتا ہے جس کا رہن سہن عوامی ہے، افکار و خیالات عوامی ہیں، قدریں، محبتیں اور نفرتیں عوامی ہوں۔ جس نے جمہوریت کے نام پر ڈاکہ ڈالنے والوں کے خلاف عوامی جنگ لڑی ہو۔ جالب کا قصور یہ تھا کہ وہ ملک میں امن اور مساوات کا حقیقی روپ دیکھنا چاہتا تھا۔

جنوں کے بس میں ہے میرا پری جمال وطن
وہ ظلم اس پہ ہوئے ہیں کہ ہے نڈھال وطن
اسے رہائی ملے تو میری رہائی ہو
ازل سے ہے میری صورت خراب حال وطن (26)

جالب کے نزدیک وطن اور ملک دو الگ حقیقتیں ہیں۔ ان کے نزدیک مملکت انسان کی بنائی ہوئی چیز ہے جبکہ وطن ایک قدرتی جذبہ ہے۔ ماں کا پیار ہے۔ جس کے خلوص کو کوئی نہیں جھٹلا سکتا۔ اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے سعید انجم لکھتے ہیں:

"جالب نے اس فرق کو محسوس کیا جو مملکت اور وطن میں ہوتا ہے۔ ان کی شاعری وطن اور اہل وطن کی محبت سے بھری ہوئی ہے۔ اس لیے بھیگیا لہو لہان ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں وطن کو مانتا ہوں لیکن جو تم قانون بناؤ، دستور بناؤ اور حکم دو اس کو بھی میں آنکھیں بند کر کے مان لوں تو یہ ممکن نہیں۔"[27]

حبسیہ ادب بھی مزاحمتی ادب کا ایک حصہ ہے اور مزاحمتی ادب میں جذبات کے برملا اظہار کی بجائے بعض اوقات، تشبیہات اور استعارات کے پردے میں چھپا کر بات کی جاتی ہے۔ جالب نے بھی قفس، آشیاں، صیاد، گلشن، مقتل، صحرا اور چراغ کے استعارے استعمال کیے لیکن جالب کا انداز دوٹوک اور واضح ہے۔ جالب کی مزاحمتی شاعری فیض سے زیادہ بے باک ہے۔ اشارے اور کنایئے کے استعمال سے کہیں کہیں طنز پیدا کی گئی ہے لیکن وہ اتنی غیر مبہم نہیں کہ عوامی سطح پر سمجھی نہ جاسکے۔

صیاد نے یوں ہی تو نہیں قفس میں ڈالا
مشہور گلستان میں بہت میری فغاں تھی[28]

نظیر اکبر آبادی کی سماج دوست آواز جب زیر زمین جا کے بھی مطمئن نہ ہوئی تو جالب کی شکل میں اُس کا دوبارہ ظہور ہوا اور نظیر ہی کی طرح اپنے عہد کے ناقدوں نے ان کے ساتھ مخالفانہ رویہ رکھا، ان کی شاعری کو سیاسی اور موضوعاتی کہہ کر غیر ادبی قرار دیا گیا۔ دوسرے شعرا کے مقابلے میں ان کے مقام و مرتبے کو نظر انداز کیا گیا۔ ورنہ اگر غیر جانبداری سے جالب کی شاعری کا اس عہد کے سیاسی اور سماجی تناظرات کی روشنی میں دوسرے معاصر شعرا سے تقابل کریں تو ان کے ہم عصر شعرا ان کے سامنے ایسے پھیکے پڑیں گے جیسے سورج کے نکلنے سے ستاروں کی روشنی ڈھل جاتی ہے۔

حوالہ جات:

1. صائمہ علی، "اردو نثر میں حبسیہ عناصر، ایک مطالعہ "مشمولہ: تحقیق نامہ، جی سی یونیورسٹی لاہور، جنوری تا جون 2014ء، ص:127
2. سبط حسن، "سچا عوامی شاعر"، مشمولہ، حبیب جالب شخصیت اور شاعری، جریدہ عالمی اردو ادب، حبیب جالب نمبر، جلد 009، ایڈور ٹائزر پبلشر، دہلی، 1994ء، ص:36
3. حبیب جالب، "کلیات حبیب جالب"، ماورا پبلی کیشنز، لاہور، 2005ء، ص 343
4. زاہدہ حنا، "یہ عشق نہیں آساں" مشمولہ، حبیب جالب شخصیت اور شاعری، جریدہ عالمی اردو ادب، حبیب جالب نمبر، جلد 009، ایڈور ٹائزر پبلشر، دہلی، 1994ء، ص:30
5. حبیب جالب، "حرف سردار"، اردو مرکز، لندن، 1982ء، ص:10-11
6. حبیب جالب، "گوشے میں قفس کے"، مکتبہ کارواں، لاہور، ص:59
7. حبیب جالب، "کلیات حبیب جالب"، ماورا پبلی کیشنز، لاہور، 2005ء، :266
8. حبیب جالب، "گوشے میں قفس کے"، مکتبہ کارواں، لاہور، ص:59
9. حبیب جالب، "حرف سردار"، اردو مرکز، لندن 1986ء، ص:120
10. حبیب جالب، "گوشے میں قفس کے"، مکتبہ کارواں، لاہور، ص:87
11. حبیب جالب، "حرف سردار"، اردو مرکز، لندن 1986ء، ص:322
12. خالد محمود، پروفیسر، " پاکستان کے مزاحمتی کلچر کی علامت"، مشمولہ، حبیب جالب بیسویں صدی کا عوامی شاعر، مرتب ظہور احمد خان، فکشن ہاوس، لاہور، 1993ء، ص:99-100
13. حبیب جالب، "گوشے میں قفس کے"، مکتبہ کارواں، لاہور، ص:64
14. ایضاً، ص:37
15. ایضاً، ص:32

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL

16. حبیب جالب، "کلیات حبیب جالب"، ماوراپبلی کیشنز، لاہور، 2005ء، ص276

17. مسلم شمیم، "حبیب جالب"، مشمولہ حبیب جالب۔ میں طلوع ہو رہا ہوں، مرتب، پرویز رشید، جالب پبلی کیشنز، کراچی، 2005ء، ص:68

18. حبیب جالب، "گوشے میں قفس کے"، مکتبہ کارواں، لاہور، ص:45

19. ایضاً، ص:43

20. ایضاً، ص:33

21. زاہد فخری، "حبیب جالب، زندہ شاعر" مشمولہ حبیب جالب۔ بیسویں صدی کا عوامی شاعر، ظہور احمد خان، فکشن ہاوس، لاہور، 1993ء، ص:139

22. حبیب جالب، کلیات حبیب جالب، ماوراپبلی کیشنز، لاہور، 2005ء، ص:274

23. حسن عابدی، "جالب روشن دنوں کی بشارت "" مشمولہ، حبیب جالب میں طلوع ہو رہا ہوں، سعید پرویز، جالب پبلی کیشنز، کراچی، 2005ء، ص:89

24. حبیب جالب، "گوشے میں قفس کے"، مکتبہ کارواں، لاہور، ص:82-83

25. ایضاً، ص:30-29

26. حبیب جالب، "حرف سر دار"، اردو مرکز، لندن 1986ء، ص:339

27. سعید انجم، "جالب کے دو کبوتر"، مشمولہ، حبیب جالب شخصیت اور شاعری، جریدہ، عالمی اردو ادب، حبیب جالب نمبر: جلد 009، ایڈور ٹائزر پبلشر، دہلی، 1994ء، ص:205

28. حبیب جالب، "کلیات حبیب جالب"، ماوراپبلی کیشنز، لاہور، 2005ء، :267